ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی*

اختر الایمان کی شاعری۔ شکستِ اقدار کا نوحہ

Abstract: *The poets who saw the capacity of human beings with universal extension in modern Urdu poetry, Akhtar ul Iman is prominent among them with mature thinking. He has optimistic view but in addition to this he is aware of the destruction of values in contemporary age. The mourning of the destruction of values is prominent in the most of his poems but in "Aik Larka" and " Masjid" it is more prominent. This paper is attempt to analyse this aspect of his poetry. The fall of values may be examined in symbolic and impressive way.*

کسی سخن کار کو سمجھنے کا بنیادی وسیلہ اس کا متن ہوتا ہے لیکن بعض اوقات وسیع تر تفہیم یا ادب کے عام قارئین نیز طالب علموں تک اس فہم کی رسائی آسان کرنے کے لیے اس کے عہد کے سماجی و ادبی تناظرات خصوصاً اس شاعر کے اپنے شعری تصورات کو سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

جہاں تک اختر الایمان کے ادبی عہد کا تعلق ہے تو یہ وہ زمانہ ہے جب اردو نظم کی عمارت اقبال کے بعد جدید نظم کے ستونِ ثلاثہ میرا جی، راشد اور فیض کے زیرِ اثر تعمیر ہو رہی تھی۔ یہ شعرا موجودہ تخلیقی منظر نامے میں اپنے تصورات یا معیار بندی کے لحاظ سے کہیں بھی موجود ہوں، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان شعرا نے اردو نظم کے معاصر منظر نامے پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی شاعر اپنا اثر قائم کر رہا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک بڑا شاعر بھی ہے۔ مثلاً یہ دلچسپ نکتہ ہے کہ میرا جی، راشد اور فیض تینوں ایک وقت میں اختر شیرانی سے متاثر تھے اور اس اثر کے عکس ان کی شاعری میں بھی واضح ہیں لیکن ادب کا مورخ اس حقیقت سے گریز نہیں کر سکتا کہ یہ تینوں شعرا اپنی فکری و اسلوبی وسعت کے لحاظ سے اپنے اثر کار سے کہیں آگے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ اختر الایمان بھی اپنے کسی اثر کار شاعر سے کچھ سبقت رکھتے ہوں۔

اختر الایمان کا ادبی تناظر واضح کرنے کا مقصد محض ان کے مقام کا تعین کرنا نہیں بلکہ اس فضا کو بھی سمجھنا ہے جس میں انھوں نے اپنا ادبی سفر طے کیا۔ اس عہد کے بڑے فکری مسائل میں سماجی سطح پر معاشی ناہمواری، تہذیبی سطح پر اقدار کی گراوٹ اور فلسفیانہ طور پر وقت کا مسئلہ ایک عجیب گمبھیرتا کے ساتھ اردو نظم میں سرایت کیے ہوئے تھے۔ ترقی پسند تحریک نے معاشی ناہمواری کے خلاف احتجاج کو اپنا بنیادی نعرہ بنالیا۔ حلقہ سے وابستہ شعرا نے اگرچہ اسے نعرہ تو نہیں بنایا لیکن اسے ایک بنیادی مسئلہ ضرور قرار دیا۔ البتہ ان شعرا نے وقت اور اقدار کے مسئلے پر بھی توجہ کی اور اردو نظم کی کرافٹ کے لیے بھی تخلیقی و تنقیدی سطح پر قابلِ قدر کام کیا۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

اختر الایمان کے تصورِ شعر کو دیکھا جائے تو" بنتِ لمحات" کے دیباچے میں انھوں نے اردو کی پوری شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک حصے کو "حصار" کے باہر اور دوسرے حصے کو "حصار" کے اندر قرار دیا(۱) ۔ یہ حصار کیا ہے اور کون سی اردو شاعری ان کے نزدیک اس کے اندر تھی اور کون سی باہر۔اس سوال کا جواب انھوں نے "یادیں" کے پیش نظر میں یوں دیا ہے:

"شاعری کا موضوع وہی تھا،زلف و رُخ کی داستان ،ہجر اور وصال کے قصے،عاشق اور رقیب کی کشمکش ،محبوب کے جور و جفا رونا۔غرض کہ وہی مساکیت جو اردو کے شاعروں اور شاعری کا ورثہ رہا ہے سب کے حصہ میں آئی تھی اور سب اسی خوردہ سال محبوب کی لاش سے لپٹے ہوئے تھے۔جس کے خد وخال تو کیا استخواں بھی باقی نہیں رہے تھے۔ایسا معلوم ہوتا تھا ان شعرا کی محبت ہوا میں معلق ہے جس پر زمانے کے گرد و سرد کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ان شاعروں کا اپنے معاشرے سے کوئی واسطہ نہیں اور ان کا اپنے دور کے معاشی اور سیاسی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔اپنی تاریخ اور انسان کی نفسیات سے کوئی ناطہ نہیں" (۲)

غالباً یہ وہ الزام ہے جو اردو غزل پر دو اطراف سے بڑی شد و مد کے ساتھ لگایا جاتا رہا ہے۔ایک جدید نظم کے بعض مبلغین کی طرف سے جب کہ دوسرا بعض ترقی پسند حلقوں کی طرف سے۔جدید نظم کے کچھ ناقدین نے اردو غزل کو روایت پیٹنے کے مترادف قرار دیا تو بعض ترقی پسند تصورات کے تحت ہماری شاعری جاگیر دارانہ عہد کی پیداوار ہے۔اب جب کہ متن کو پڑھنے اور سمجھنے کے سلیقے سمجھائے جا رہے ہیں تو ان الزامات کی حقیقت بھی کھل گئی ہے کہ اس طرح کے فتوے محض جلد بازی میں یا خود کو نیا ثابت کرنے کی کوشش میں دیے گئے ورنہ اردو غزل سماج سے پوری طرح جڑی ہوئی تھی اور شعرا اپنے عہد کے معاشی اور سیاسی حالات ادراک بھی رکھتے تھے نیز اپنی تاریخ اور انسانی نفسیات سے ان کا ایک گہرا ناتا تھا۔

قطع نظر اس کے کہ اختر الایمان کے اردو غزل پر الزامات درست ہیں یا نہیں،ان کا یہ احساس ضرور قابلِ قدر ہے کہ وہ خود کو کسی حصار میں پابند نہیں دیکھنا چاہتے اور اپنے شعری عمل کو سماجی شعور سے جدا نہیں کرتے نیز خود کو کسی روایتِ کہنہ کے بندھن سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔اختر الایمان کی شاعری اپنے اندر ایک بھرپور سماجی شعور رکھتی ہے اور ان فکری و تہذیبی مسائل کا احاطہ کرتی ہے جس سے عہدِ جدید کا انسان دوچار ہے لیکن ان کی نظموں کی مجموعی فضا کو دیکھیں تو یہ احساس بہت حد تک درست درست معلوم ہوتا ہے کہ:

"اختر الایمان کی فکری توجہ کا بنیادی مرکز زندگی کی بدلتی ہوئی قدریں ہیں"(۳)

اقدار کی تبدیلی یا گراوٹ کی عموماً وجہ جدید سائنسی اور صنعتی عہد کی تشکیل کو قرار دیا جاتا ہے لیکن اختر الایمان کے ہاں ایسا کوئی مسئلہ پیشِ نظر نہیں بلکہ وہ انسان کے سائنسی ارتقا کے مداح دکھائی دیتے ہیں اور اس ترقی کے مدارج کو ایک مثبت انداز میں دیکھتے ہیں۔اُن

کی نظم "اعتماد" اس امر کی غماز ہے کہ اختر الایمان انسان کی تسخیرِ کائنات کی صلاحیت کے لیے مدح وستائش کے جذبات رکھتے ہیں۔ وہ انسان کے اس جوہر کے بارے میں نہایت پر اعتماد بھی ہیں، جس کے باعث وہ تسخیر مظاہر کی استعداد رکھتا ہے:

بولی خود سر ہوا: "ایک ذرہ ہے تو
یوں اڑا دوں گی میں" موج دریا بڑھی
بولی: "میرے لیے ایک تنکا ہے تو
یوں بہا دوں گی میں"، آتشِ تند کی
اک لپٹ نے کہا: "میں جلا ڈالوں گی"
اور زمیں نے کہا: "میں نگل جاؤں گی"
میں نے چہرے سے اپنے اُلٹ دیا نقاب
اور ہنس کر کہا: "میں سلیمان ہوں
ابنِ آدم ہوں یعنی میں انسان ہوں"(۴)

عناصرِ کائنات کو انسان کا یہ کھرا جواب اس حقیقت کا غماز ہے کہ انسان ان سب سے طاقت ور ہے۔ اس کے زورِبازو میں خدا نے وہ طاقت رکھی ہے کہ تمام موجودات کو زیر کر سکتا ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر وہ ایک ذرہ یا تنکے سے بڑھ کر نظر نہیں آتا اور اس کی اس ظاہری صورت کو دیکھتے ہوئے عناصرِ کائنات ہوا، پانی، آگ اور مٹی اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ انسان کو ختم کر دیں گے۔ حالاں کہ عناصرِ کائنات اپنے طور پر الگ الگ اور تنہا ہیں۔ لیکن آدمی کا وجود ان سب عناصر کا مجموعہ ہے۔ اس اعتبار سے وہ ان سے بڑھ کر طاقت ور ہے۔

اختر الایمان کی اس نظم میں انھوں نے انسان کو ایک زبردست قوت ثابت کیا ہے جو حوادثِ زمانہ سے گھبرانے کے بجائے ان پر خندہ زن ہے۔ اس کا وجود اعتماد سے معمور ہے۔ وہ نہ صرف سیلِ زمانہ سے برسرِپیکار ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے بل کہ اس کا رخ موڑنے کی اہمیت بھی اس کے بازوؤں میں ہے۔ مگر یہ انسان جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر لیا ہے، کیا وہ تہذیبی اقدار کی سطح پر اپنی زندگی کی شبِ تاریک سحر کر سکا ہے یا نہیں۔ اختر الایمان کی نظموں کی نظموں "زندگی کے دروازے" اور "پرانی فصیل" سے کچھ حصے ملاحظہ ہوں:

"پا برہنہ و سراسیمہ سا اک جمِّ غفیر
اپنے ہاتھوں میں لیے مشعلِ بے شعلہ ودود
مضطرب ہو کے گھروں سے نکل آیا ہے
جیسے اب توڑ ہی ڈالے گا یہ برسوں کا جمود

ان پپوٹوں میں یہ پتھرائی ہوئی سی آنکھیں
جن میں فردا کا کوئی خواب اجاگر ہی نہیں
کیسے ڈھونڈیں گی درزیست، کہاں ڈھونڈیں گی
اِن کو وہ تشنگئی شوق میسر ہی نہیں(۵)

کہیں شکلیں بسورے، کلبلاتے، رینگتے گرتے
غلاظت آشنا، جھلسے ہوئے انسان کے پلے
بھٹکتے، بھنبھناتے، لوٹتے، گلیوں میں آوارہ
تمناؤں میں جن کی رات دن کھینچے گئے چلے
غرض اک دور آتا ہے کبھی اک دور جاتا ہے
مگر میں دو اندھیروں میں ابھی تک ایستادہ ہوں
برے تاریک پہلو میں بہت افعی خراماں ہیں
نہ توشہ ہوں، نہ راہی ہوں نہ منزل ہوں نہ جادہ ہوں(۶)

گویا عہدِ جدید کا انسان ایک بے معنی سی کوئی چیز ہے۔ زندگی کی امنگ سے عاری، مستقبل سے بے خبر اور جذبوں سے محروم۔ انسان اور انسانیت کا مفہوم کہیں گم ہو گیا۔ وہ قدریں جن کی بنا پر انسان کو شرف اور برتری کے لائق سمجھا گیا اور اسے حیوانات سے امتیاز دیا گیا، اب انسان ان قدروں سے دور ہو تا جارہا ہے۔ "آب جو" کے دیباچے میں اختر الایمان نے لکھا ہے:

"(میری شاعری) ایک ایسے انسانی ذہن کی تخلیق ہے جو رات دن بدلی ہوئی سیاسی، معاشی اور اخلاقی قدروں سے دوچار ہے جو اس معاشرہ اور سماج میں زندہ ہے جسے Ideal نہیں کہا جا سکتا۔ جہاں عملی زندگی اور اخلاقی قدروں کا ٹکراؤ ہے، جہاں انسان کا ضمیر اس لیے قدم قدم پر ساتھ نہیں دے سکتا کہ زندگی ایک سمجھوتہ کا نام ہے اور سماج کی بنیاد اعلیٰ اخلاقی قدریں نہیں مصلحت ہے اور ضمیر کو چھوڑا اس لیے نہیں جا سکتا کہ اگر انسان محض حیوان ہو کر رہ گیا تو ہر اعلیٰ قدر کی نفی ہو جائے گی"(۷)

اعلیٰ اقدار کی نفی کا یہی وہ پہلو ہے جس نے انسان سے برتری کا احساس چھین لیا ہے اور افلاک کو تسخیر کرنے والا وجود ذرّہ بے مایہ ہونے کے کرب میں مبتلا ہے۔ مادی عہد میں انسان اب محض ایک کیڑا ہے۔ زمین کی کم تر بلکہ کم ترین مخلوق۔ انسان زندہ نہیں ہے محض زندگی کا درد سہہ رہا ہے اپنے زندہ ہونے کی سزا بھگت رہا ہے۔

زندگی کی بے بسی اُف وقت کے تاریک جال
درد بھی چھننے لگا امید بھی چھننے لگی
مجھ سے میری آرزوئے دید بھی چھننے لگی
پھر وہی تاریک ماضی پھر وہی بے کیف حال(۸)

اس نظم میں "پھر" کی تکرار اس بات کی مظہر ہے کہ کرب نے ایک تسلسل اختیار کر لیا ہے اور ہر آنے والے نئے لمحے میں اس کے لیے وہی پرانا درد موجود ہے اور وہ چیخ اُٹھتا ہے کہ "پھر وہی تاریک ماضی پھر وہی بے کیف حال"۔ زندگی کا یہ کرب اختر الایمان کے نزدیک اس عہد کی مادیت پسندی کے باعث ہے کہ انسان اپنے شکم کا جہنم بھرنے کے لیے کہاں کہاں انگاروں میں ہاتھ مارتا ہے۔ وہ ایک مشین کے پرزے کی طرح ہے اور اس کی اپنی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا۔ اختر الایمان کی نظم "یہ دور" اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔

"کوئی آغاز نہ انجام نہ منزل نہ سفر
سب وہی دوست ہیں دہرائی ہوئی باتیں ہیں
چہرے اترے ہوے دن رات کی محنت کے سبب
سب وہی قضیے، شکایات، مداراتیں ہیں
سب وہی بغض و حسد ، رشک و رقابت، شکوے
دامِ تزویر ہے، الجھاؤ کی سو گھاتیں ہیں(۹)

نظم کے اختتام پر اس بے کیف فضا میں شاعر کی اپنی محبوبہ سے اچانک ملاقات ہوتی ہے لیکن شاعر اس کے چہرہ کو دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ محبوبہ کے چہرہ پر کوئی نکھار نہیں ہے اور "نغمگی جسم کی، وہ لوچ سا، نشہ سا مدام" کہیں گم ہو گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

سچ کہو تم ہی ہو؟ آتا نہیں آنکھوں کو یقین(۱۰)

نظم "یہ دور" میں جس طرح شاعر اپنی محبوبہ کے خدوخال تک نہیں پہچان پا رہا اسی طرح نظم "ایک لڑکا" کا مرکزی کردار شاعر کو پہچاننے میں دقت کا شکار ہے۔ لڑکے کا کردار کسی خارج سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ دراصل شاعر کا ہم زاد ہے جو اسے بغور دیکھتا ہے اور بار بار یہ سوال دہرتا ہے کہ کیا وہ اختر الایمان ہے؟ یہ سوال اپنے اندر تحیر اور تحقیر دونوں پہلو رکھتا ہے، تحیر اس حوالے سے کہ انسان جو خود کو اس قدر مہذب سمجھتا ہے کیا یہی اس کی تہذیبی سطح ہے اور تحقیر اس زاویے سے کہ انسان اس اخلاقی گراوٹ اور بے چہرگی کے باعث آج بھی اپنی تمدنی حیثیت پر ناز کرتا ہے۔ اسے یہ احساس بھی نہیں کہ وہ کسی ارفع مرتبے سے کسی اسفل مقام تک آ گیا ہے۔

اختر الایمان کی نظم "ایک لڑکا" کا مرکزی کردار اسی اخلاق زوال کا سوال اُٹھاتا ہے۔ بظاہر یہ کردار شاعر کا ماضی ہے جو اسے لمحہ حال میں جھنجھوڑتا ہے لیکن اس کردار کو عمیق نظر سے دیکھا جائے تو شمیم حنفی کے بقول:

"یہ لڑکا سرد سر فضا میں زندگی کی حرارت، توانائی اور مہم جوئی کی علامت بن کر مہذب انسان کے اجتماعی زوال کی طرف اشارہ کرتا ہے"(۱۱)

نظم میں شاعر نے اپنے آپ کو بھی ایک کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو اس اخلاقی بحران اور تہذیبی انحطاط کا حصہ ہے۔ نظم کے پہلے بند میں اس ماضی کی تصویر ہے جہاں انسانوں نے فطرت کی پرسکوں آغوش میں محبت سے مملو زندگی بسر کی۔ شاعر اس تصویر کو حسرت واندوہ سے دیکھتا ہے کہ اب وہ اس سے محروم ہے۔ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے ایک لڑکا اس کے سامنے آتا ہے اور بقولِ شاعر:

یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہو؟(۱۲)

لڑکے کا سوال اس لیے نہیں کہ وہ اختر الایمان کو پہچانتا نہیں ہے یا اس کے خدوخال سے آگاہ نہیں، بلکہ اب اختر الایمان کا طرزِ حیات، طرزِ فکر اور طرزِ معیشت اس قدر بدل چکا ہے، اس کا ضمیر ایسے تہذیبی عیوب سے بہت بدل گیا ہے اور اب اختر الایمان کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔ شاعر اعتراف کرتا ہے کہ رازقِ دوجہاں، خالقِ دوجہاں ہی ہے لیکن اب معاشرتی ڈھانچہ ایسے پیرائے میں تشکیل پا چکا ہے کہ خدا سے ایمان اُٹھتا جا رہا ہے، بتوں سے امید اور خدا سے نومیدی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ یہ انحطاط اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ضمیر بھی ملامت نہیں کرتا۔ چناں چہ جب لڑکا شاعر سے بار بار وہی سوال دہراتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے:

"جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم
اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا
اسی کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم ،پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے ،یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے ،جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں(۱۳)

مغرب میں بھی جب یہ آواز گونجی تھی کہ "خدا مر چکا ہے" تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی تھا کہ روحانی قدروں پہ موت طاری ہو گئی ہے، ظاہر ہے زمین پر خدا کے وجود کا ادراک انھی قدروں سے ہوتا ہے۔ جب یہ ختم ہو گئیں تو گویا خدا زندہ نہیں رہا اور اسے انسان کی مادی سوچ نے مار دیا ہے۔ اختر الایمان کی نظموں میں بھی موت کا مفہوم کچھ ایسا ہی فکری پس منظر رکھتا ہے اور اس کی طرف اشارہ انھوں نے

"آب جو" کے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔ اُن کے بقول:"جو آدمی بستر مرگ پہ ہے وہ ان پر ان قدروں کا علامیہ ہے جو آپ مر رہی ہیں"(۱۴)ان کی نظمیں "سوگ"، "موت"، "کتبہ"، "قبر"، "مرگ نغمات" پڑھی جائیں تو ان میں ایک تہذیبی نوحہ واضح طور پر سنائی دیتا ہے۔ اگرچہ ان نظموں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر بلال سہیل نے ان کو اختر الایمان کے بچپن میں بعض واقعاتِ مرگ کے ساتھ جوڑا ہے جن میں ایک حد تک صداقت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے خیال میں مرگ سے وابستہ:

> "یہ مخصوص علامتیں اور تمثالیں کسی خیالی یا کتابی دنیا سے نہیں، بل کہ شاعر کے اپنے تجربے اور مشاہدات سے صورت پذیر ہو رہی ہیں"(۱۵)

تاہم نظموں کا یہ متن تہذیبِ مرگ کی اس فضا کا حصہ ہے جو اختر الایمان کی شاعری میں قدروں کے زوال اور فرد کی گم شدگی کے باعث تشکیل پائی ہے۔ سماجی طور پر دیکھا جائے تو فرد کی گم شدگی کا سبب عصرِ حاضر کا مادی ڈھانچہ ہے لیکن اس مادی تشکیل کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اختر الایمان کے ہاں اس سوال کا کوئی جواب نہیں البتہ عصری انسان اور اس کی روز مرہ مشینی زندگی کی تصویر کاری کرتے ہوئے اس کی بے بسی اور لمحہِ آئندہ کی دہشت کو عمدہ اسلوب میں بیان کرتے ہیں:

پھر نگاہوں پہ امڈ آیا ہے تاریک دھواں
ٹمٹماتا ہے مرے ساتھ یہ مایوس چراغ
آج ملتا نہیں افسوس پتنگوں کا نشاں
میرے سینے سے الجھنے لگی فریاد مری
ٹوٹ کر رہ گئی انفاس کی زنجیرِ گراں
توڑ ڈالے گا یہ کم بخت مکاں کی دیوار
اور میں دب کے اسی ڈھیر میں رہ جاؤں گا(۱۶)

اختر الایمان کی شاعری میں اقدار کی شکست کا موضوع روحِ فکر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ موضوع کہیں بہت واضح انداز میں برتا گیا ہے تو کہیں محض طرزِ احساس کی صورت میں مصور کیا گیا ہے۔ اختر الایمان کو اگرچہ اردو نظم کے ان ناموں میں شمار تو نہیں کیا جاتا جو علامت پسند تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے میرا جی، مختار صدیقی یا اس طرح کے دیگر اہم نظم نگاروں کی طرح مخصوص، عمیق اور پیچیدہ علامتیں استعمال نہیں کی ہوں، تاہم اقدار کی شکست پر گریہ زاری کے حوالے سے ان کے ہاں بعض علامتیں موجود ہیں۔ ممکن ہے جب انھوں نے یہ علامتیں استعمال کی ہیں تو اس وقت کی ادبی فضا میں ان کا کوئی مفہوم اور لیا گیا ہو اور اس سے شاعر گلہ مند بھی ہوا ہو (۱۷)۔ تاہم اردو تنقید میں نظم کی قرأت کے سلیقوں سے آشنائی کے بعد ان علامتوں کی تفہیم نہ صرف قدرے سہل ہے بلکہ تخلیق کار کے اصل مدعا تک رسائی میں بھی معاون ہیں۔ روحانی اقدار کی شکست کے سلسلے میں اختر الایمان کی نظم "مسجد" بہت اہم ہے یہ ایک علامتی نظم ہے

جس میں ندی کے بہاؤ کی ذریعے وقت کے دھارے کو رومانی اقدار منہدم کرتے دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی دل چسپ امر ہے کہ نظم میں الفاظ کی بنت اور تراکیب کا اسلوب اقبال سے اثر انگیزی کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔

"فرش جاروب کشی کیا ہے سمجھتا ہی نہیں
کالعدم ہو گیا تسبیح کے دانوں کا نظام
طاق میں شمع کے آنسو ہیں ابھی تک باقی
اب مصلیٰ ہے نہ منبر نہ موذن نہ امام
آ چکے صاحبِ افلاک کے پیغام وسلام
کوہ و در اب نہ سنیں گے وہ صدائے جبریل
اب کسی کعبے شاید نہ پڑے گی بنیاد
کھو گیا دشتِ فراموشی میں آوازِ خلیل
چاند پھیکی سی ہنسی ہنس کے گزر جاتا ہے
ڈال دیتے ہیں ستارے دھلی چادر اپنی
اس نگارِ دلِ یزداں کے جنازے پہ بس اک
چشم نم کرتی ہے شبنم یہاں اکثر اپنی
ایک میلا سا ، اکیلا سا فسردہ سا دیا
روز رعشہ زدہ ہاتھوں سے کہا کرتا ہے
تم جلاتے ہو کبھی آ کے بجھاتے بھی نہیں
ایک جلتا ہے مگر ایک بجھا کرتا ہے
تیز ندی کی ہر اک موج طلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہا لوں گی تجھے توڑ کے ساحل کی قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی!(۱۸)

ایک غیر اقداری معاشرے میں اخترالایمان کی منظومات اسلوب کی سطح پر ایک غم انگیز لے کے مساوی ہیں۔ ان نظموں میں اقدار کی شکست کا گریہ تو ہے لیکن ان کے خلاف احتجاج کی ہر صدا اقدرے مدھم ہے۔ اخترالایمان کا شمار ان شعرا میں نہیں کیا جاسکتا جن

کے ہاں کسی فریاد یا احتجاج کی شدت پسندانہ لے سنائی دے یا وہ کسی ایسے آدرش کی طرف رجوع کرتے دکھائی دیتے ہوں جو ایک غیر اقداری معاشرے میں انقلابی تبدیلی کا باعث بنے اور یہی وہ عنصر ہے جو انھیں ترقی پسند شاعروں سے قدرے منفرد ظاہر کرتا ہے۔" تاریک ستارہ سے پہلے" کے ابتدائی صفحہ پر اخترالایمان نے محرومی کا ایک مصرعہ درج کیا ہے:

دردہی درد ہوں فریاد نہیں ہوں شاید

تو یہ مصرعہ ایک اعتبار سے ایک احساس بھی ہے جو وہ اپنے تخلیقی طور یا شعری اسلوب کے سلسلے میں محسوس کرتے تھے۔ان کی نظمیں زیاں کے بعد احساسِ زیاں کا ایک غم انگیز اظہار ہیں لیکن زیاں کے ازالے کے کسی آدرش کا نقشہ نہیں پیش کرتیں۔

حوالہ جات:

۱۔ اخترالایمان:"سر وسامان"،کراچی،المسلم پبلشرز ۱۹۹۲ء،ص۳۴۵
۲۔ ایضاً،ص۳۴۵
۳۔ عقیل احمد صدیقی:"جدید اردو نظم: نظریہ اور عمل" ملتان،بیکن ہاؤس بکس ۲۰۱۴ء، ص۲۲۱
۴۔ "سر وسامان"،ص ۲۰۱
۵۔ ایضاً،ص۶۱
۶۔ ایضاً،ص۵۲
۷۔ ایضاً،ص۵۴۲
۸۔ ایضاً،ص۷۷
۹۔ ایضاً،ص ۳۱۵
۱۰۔ ایضاً،ص۳۱۷
۱۱۔ شمیم حنفی:"نئی شعری روایت"، دہلی، مکتبہ جامعہ،۱۹۸۷ء،ص ۱۱۰
۱۲۔ "سر وسامان":ص ۲۹۳
۱۳۔ ایضاً،ص۲۹۶
۱۴۔ ایضاً،ص۵۳۹
۱۵۔ ڈاکٹر بلال سہیل:"اخترالایمان کی خودنوشت کا نظم نامہ" نقاط(نظم نمبر) اکتوبر ۲۰۱۱ء،ص ۴۱۶۔
۱۶۔ سر وسامان، ص۳۶
۱۷۔ اخترالایمان نے "آب جو" کے دیباچے میں بعض ناقدین اور قارئین سے یہ شکوہ کیا تھا کہ:
"ان نظموں کے جس ماحول اور فضا نے سرسری پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا کہ یہ نظمیں قنوطی ہیں وہی دراصل ان کا حسن ہے اس لیے کہ میرا مقصد یہ نظمیں کہنے سے نہ کسی ویران مسجد کا خاکہ کھینچنا تھا اور نہ کسی دم توڑتے ہوئے آدمی کی کہانی لکھنا تھا۔یہ دونوں نظمیں علامتی نظمیں ہیں جن کا رواج ہماری شاعری میں اٹھارہ سال پہلے بھی نہیں تھا اور آج بھی نہیں ہے۔" :ص۳۹
۱۸۔ ایضاً، ص۴۴، ۴۵

☆☆☆☆☆